"اسلامی اتحاد"

مسلکِ اہلِ بیتؑ کی روشنی میں

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ

۱۴

"اسلامی اتحاد"

مسلکِ اہلِ بیتؑ کی روشنی میں

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ مدظلہ العالی

ترجمہ

علامہ سید رضی جعفر نقوی

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

۲ - بے - ۵/۴ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

نام کتاب ——— اسلامی تعلیم مکتب اہلبیت کی روشنی میں

اثر ——— علامہ سید محمد حسین فضل اللہ

ترجمہ ——— مولانا سید رضی جعفر نقوی

کتابت ——— سید جعفر صادق

ناشر ——— دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

تاریخ اشاعت ——— جمادی الثانی ۱۴۱۲ھ ۔ جنوری ۱۹۹۲ء

تعداد ——— ۵۰۰

دیباچہ

مسلمانوں کے مابین اختلاف فکر و نظر کی تاریخ خود ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ حضرت ختمی مرتبت کے اصحاب و انصار کے درمیان ایک سے زیادہ رجحانات کا پایا جانا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ رجحانات میں پایا جانے والا یہ تفاوت رفتہ رفتہ باقاعدہ مکاتب فکر کی صورت اختیار کر گیا اور امت مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔

تاریخ قدیم سے ہی پیدا شدہ فاصلوں کو سمیٹنے اور مکاتب کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کے لیے مخلص اور باصفا ہستیوں نے ہر ممکن کوششوں کا آغاز کر دیا اور آج بھی جبکہ امت زبوں حالی اور پستی کا شکار ہے یہ کوششیں جاری ہیں۔

ماضی میں پیکرِ امت سے انتشار اور افتراق کو دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہستیوں کی نظر میں صرف ایک مقصد "اسلام اور مسلمانوں کا تحفظ اور ترقی" تھا۔ لیکن حال حاضر میں مختلف اسلامی خطوں میں اسلامی اتحاد کی دعوت دینے والوں کے مقاصد جدا جدا ہیں۔

ہمیں اتحاد ملت مسلمہ کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں بلکہ

ہم اس عمل کو ایک دینی فریضہ کا مقام دیتے ہیں لیکن اس اتحاد کی دعوت دینے والوں کے جواب میں لبیک کہنے سے قبل نہایت ہوشیاری اور دقتِ نظر سے ان کے مقاصد اور طریقہ کار کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

کیونکہ دورِ حاضر میں اتحادِ امت کا خواب ہر دردمند مسلمان کی آنکھوں میں بسا ہوا ہے اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اتحادِ امت مسلمانوں کے بے شمار مسائل و مشکلات کا حل ہے۔ جبکہ انتشار و افتراقِ امتِ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ۔ اسی بنا پر ہر مردِ مسلمان اس نعرہ کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ اور آج امتِ مسلمہ کے درمیان یہ مقبول نعرہ اور مطلوب ہدف ہے۔

لہٰذا ہمارے سامنے اتحادِ امت کا حقیقی مقصد اور طریقہ کار واضح و روشن ہونا چاہیے۔ ذیل میں ہم موجودہ دور میں اسلامی اتحاد کے لیے سرگرم عمل بعض گروہوں کے مقاصد و محرکات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان مقاصد و محرکات میں درست اور حقیقتاً اسلام کے لیے مفید مقصد کا انتخاب ہم اپنے بالغ نظر قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

الف: اسلامی اتحاد کا دم بھرنے والے ایک گروہ کی نظر میں اتحاد کی عملی صورت یہ ہے کہ تمام مکاتب اپنی اپنی فکر و عقیدے سے دستبردار ہو جائیں، اپنے اختلافات خواہ وہ کتنے ہی وقیع ہوں کو پس پشت ڈال کر بغیر بحث و تحمیص اور جستجو و تحقیق کے ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔

ب: یہ گروہ امت میں اتحاد و اتفاق کے لیے کسی مذہبی بنیاد کا قائل نہیں، یہ حضرات مسلمانوں کو ایک نسلی اور وطنی قومیت کی بنیاد پر اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور اس طرح ان کا مقصد ایک سیکولر معاشرہ کی تشکیل ہے۔ ان حضرات کا نظریہ ہے کہ مذہبی معاملات مساجد و عبادت گاہوں تک محدود رکھے جائیں اور اجتماعی اور سیاسی معاملات میں مذہب کو پس پشت ڈال کر قومی اتحاد کا قیام عمل میں لایا جائے۔

افسوس کہ بعض علماء کے رویہ اور لادین عناصر کی ریشہ دوانیوں کے باعث عام طور پر یہ نظریہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

ج: حکومت کے استحکام اور بقا کے لیے امن و امان کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ امن و امان کی ایک صورت معاشرہ کے مختلف طبقات اور نسلی' لسانی اور فرقہ وارانہ گروہوں کے مابین بھائی چارے کا قیام ہے۔

حکمران طبقہ ہمیشہ ایسے ہی اتحاد کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک مسند آرا ر حکومت رہا جا سکے اور حکومت مستحکم انداز میں قائم و دائم رہے۔ بالفاظ دیگر اس دعوتِ اتحاد کا مقصد اپنی حکومت کا قیام و دوام ہے۔ اس کے پس پشت اسلام اور مسلمانوں کی بہتری' ترقی اور ان کے مفادات نہیں۔

د: حزب مخالف کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرہ کے مختلف طبقات کو حکومت کے خلاف منظم کیا جائے تاکہ اس اتحاد کی طاقت سے مسند اقتدار تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ اس اتحاد کا بنیادی مقصد بھی اپنے اقتدار کا قیام اور اپنے مفادات کا حصول ہے۔ اس کے پیچھے بھی کوئی اعلیٰ جذبہ اور ارفع مقصد نہیں اور یہاں بھی اسلام اور مسلمانوں کے مفادات' اتحاد کا بنیادی محرک و مقصد نہیں۔

ح: جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا تھا کہ طول تاریخ میں وحدت اسلامی کے لیے سرگرم عمل مخلص و باصفا ہستیوں کا بنیادی مقصد اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے جستجو کرنے والا گروہ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ اس گروہ کی نظر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں رکاوٹ اور امت اسلامی کی پستی اور زبوں حالی کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب اتحاد باہمی کا فقدان ہے۔ اور امت کے اتحاد اور ہم بستگی کے لیے جدوجہد کرنے والے اس گروہ کا مقصد اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور پرچم توحید کی سربلندی کے سوا کچھ نہیں۔ اس راہ میں ان کا لائحہ عمل ایسے رجحانات کی آبیاری

ہے جس کے نتیجے میں امت اپنے باہمی اختلافات کو علمی و منطقی طریقے اور شائستہ و پُروقار انداز میں گفت و شنید اور باہمی تفاہم کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرے۔ مسلمان فرقوں کا ایک دوسرے کے افکار و نظریات سے آگاہ ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ دشمن ان کے درمیان غلط فہمیاں اور شکوک و شبہات پیدا نہ کر سکے۔

وحدت امت کے لیے سرگرم عمل اس گروہ کے سرخیل امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور آپؑ کے بعد بقیہ گیارہ ائمہ معصومین علیہم السلام اسی راہ میں سرگرم عمل رہے اور جسد امت کو انتشار و افتراق سے محفوظ رکھنے کے لیے ان ہستیوں نے بیش بہا قربانیاں پیش کیں۔

عدم حضور ائمہ علیہم السلام میں جید علمائے اسلام اور مجتہدین کرام نے اس بار گراں کو اٹھایا اور امت کی شیرازہ بندی کے عظیم فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلسل کوششیں جاری رکھیں۔ اس سلسلہ میں اپنے اپنے دور کی نابغہ روزگار شخصیات حضرت علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر اور حضرت امام خمینی علیہ الرحمہ سرفہرست ہیں۔

عصر حاضر میں حضرت امام خمینیؒ کی بلند کی ہوئی ندائے وحدت امت چہار دانگ عالم میں گونج رہی ہے۔ وحدت اسلامی کے سلسلہ میں آپ کی سعی پیہم اور تیزی کے ساتھ پھیلتے ہوئے اس کے اثرات نے اسلام دشمن قوتوں کی صفوں میں کھلبلی مچادی ہے اور اتحاد امت سے ان کا خوف اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ انھوں نے اسلامی ممالک میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ "افتراق امت" کے مشن کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تقویت پہنچانا شروع کر دی ہے۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی فرقوں کے باعمل، دردمند اور مخلص علمائے کرام ایسی سوچ کو فروغ دیں اور ایسے عملی طریقے ایجاد کریں جن کا مقصد باہمی اختلافات کو علمی اور منطقی بنیادوں پر حل کرنا ہو اور ایسے عوامل اور ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کی جائے جو مختلف اسلامی فرقوں کے مابین اختلاف رائے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں جن کے نتیجہ میں یہ فرق اسلامی باہم دست و

گریبان ہو جاتے ہیں۔

* * *

حضرت آیت اللہ علامہ محمد حسین فضل اللہ مدظلہ کی شخصیت تحریک اسلامی
سے وابستہ افراد و شخصیات کے لیے محتاج تعارف نہیں، خصوصاً عصر حاضر میں لبنان کی
سیاست میں آپ کے فعال کردار کی بنا پر آپ عالمی سطح پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔

یہ مختصر مگر شاہکار تحریر جو اپنے اندر بے پناہ مضامین کو سمیٹے ہوئے ہے
آپ کے اس خطاب پر مشتمل ہے جو آپ نے تہران میں منعقد ہونے والی "عالمی اہل بیت"
کانفرنس (۱۸ اور ۱۹ مئی سنہ ۱۹۹۰ء) میں فرمایا۔

دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان نے اس مقالہ کی افادیت و اہمیت کے
پیش نظر اردو داں افراد کے لیے اسے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

امید ہے یہ علمی کاوش اتحاد اسلامی کے سلسلہ میں ایک مفید کوشش
ثابت ہوگی۔

سید علی شرف الدین موسوی

وَقَدْ سَمِعَ قَوْماً مِنْ أَصْحَابِهِ يَسُبُّونَ أَهْلَ الشَّامِ أَيَّامَ حَرْبِهِمْ بِصِفِّينَ:

إِنِّي أَكْرَهُ لَكُمْ أَنْ تَكُونُوا سَبَّابِينَ، وَلَكِنَّكُمْ لَوْ وَصَفْتُمْ أَعْمَالَهُمْ، وَذَكَرْتُمْ حَالَهُمْ، كَانَ أَصْوَبَ فِي الْقَوْلِ، وَأَبْلَغَ فِي الْعُذْرِ، وَقُلْتُمْ مَكَانَ سَبِّكُمْ إِيَّاهُمْ: اللَّهُمَّ احْقِنْ دِمَاءَنَا وَدِمَاءَهُمْ، وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَبَيْنِهِمْ، وَاهْدِهِمْ مِنْ ضَلَالَتِهِمْ، حَتَّى يَعْرِفَ الْحَقَّ مَنْ جَهِلَهُ، وَيَرْعَوِيَ عَنِ الْغَيِّ وَالْعُدْوَانِ مَنْ لَهِجَ بِهِ۔

جنگ صفین کے زمانے میں امیرالمومنینؑ نے سنا کہ آپ کی جماعت کے بعض لوگ اہل شام پر سب و شتم کرتے ہیں۔ جس پر آپؑ نے فرمایا:

میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تم دشنام دو لیکن اگر تم ان کے کرتوتوں کو بیان کرو، ان کے حالات کا تذکرہ کرو تو یہ ٹھیک مناسب ہے اور مقام عذر میں بلیغ تر اور رساتر ہے اور بہتر یہ ہے کہ انھیں سب و شتم کرنے کے بجائے یہ کہو کہ:

بار خدایا!

ہمارے اور ان کے خون کو بہنے سے بچا۔ ہمارے اور ان کے باہمی اصلاح کر دے۔ انھیں ان کی گمراہی سے امر حق کی طرف ہدایت فرما۔ تاکہ جو حق کو نہیں جانتا وہ اسے پہچان لے اور جو حریص اور شیفتہ گمراہی اور دشمنی ہو وہ اس غلط اور ناروا کلام سے باز رہے۔

نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۴ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز
نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۳ ترجمہ مفتی جعفر حسین علیہ الرحمۃ

۱

اسلامی اتحاد

مسلک اہل بیتؑ کی روشنی میں

"اسلامی اتحاد" کی بنیاد فکر و عقیدہ میں بھی نمایاں ہے اور ان قوانین اور ضوابط میں بھی بدرجۂ اتم واضح اور آشکار ہے جو انسانی زندگی کے لیے خداوند عالم کی جانب سے نازل ہوئے ہیں۔

2 فکر و عقیدہ کے میدان میں مسلمانوں کے مشترک عقائد: توحید، نبوت اور قیامت کے مفاہیم، اسلامی اتحاد کا مظہر ہیں۔ 2

قرآن کریم اور شریعت مقدسۂ اسلام کے وہ احکام و فرائض جن کی پابندی ہر انسان پر ضروری قرار دی گئی ہے، میں بھی اسلامی وحدت جلوہ فگن ہے۔ یہی احکام و فرائض وہ صراط مستقیم ہے جو مسلمانوں کے حرکت و سکون سے وابستہ ہے۔

❋

3) باقی رہیں عقیدہ کی تفصیلات، شریعت کی خصوصیات اور اقدار و

مفاہیم کی راہیں، تو ان میں فلسفیانہ افکار فقہی اجتہاد یا تفسیری موشگافیوں وغیرہ کی بنا پر مسلمانوں کے نظریات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نقطہ ہائے اشتراک میں بھی اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور باہمی آمیزش میں بھی آویزش کا پہلو اپنی جگہ قائم ہے) 3

❋

اور جہاں تک زندگی اور اس کی جنبش میں اس اتحاد کی مخصوص حیثیت کا تعلق ہے تو وہ اسلامی طرز تخاطب میں بھی نمایاں ہے کہ جب مسلمان دوسروں سے گفتگو کے موقع پر، یا آپس میں ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہوئے اپنے اپنے قول و فعل اور باہمی تعلقات میں اسلامی نسبت کا احترام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و ناموس کی حمایت کرتے ہیں۔ کیونکہ "اسلام" کا نصب العین ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا ہے اور ان تمام اہم مقاصد کی راہ میں جن میں ان کی زندگی سے مربوط معاملات مشترک ہیں، اسی کے ساتھ وہ موقع، راستہ اور روش کے اتحاد کی بھی پابندی کرتے ہیں۔...... اور یہ وہ باتیں ہیں جو پوری امت کو عقیدہ کی ایک لڑی میں ہم آہنگ کرنے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ الگ الگ جنبشوں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں "اسلامی" خصوصیات ایک خاص کردار ادا کرتی ہیں جن سے ان روشوں کا تنوع بھی برقرار رہتا ہے اور اتحاد کے دائرے میں رہتے ہوئے تنوع کے یہ سارے پہلو بھی امتیازی شان سے باقی رہتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے تمام مسائل میں معاشرتی صورت یہی ہے چاہے آپس میں نظریاتی اتفاق ہو یا اختلاف۔ کیونکہ بنیادی عقیدے اور اس کی دقیق فلسفی تفصیلات، جو معاملات میں باریک بینی لاتی ہیں، ان کی سطح پر کوئی "وحدت مطلقہ" قائم نہیں کی جاسکتی کیونکہ جب بھی کوئی عمومی قانون سامنے

آ ئے گا تو اس میں داخلی یا خارجی سطح پر کچھ استثنائی صورتیں بھی لازمی طور سے موجود ہوں گی۔ اور ہر نظریے کے بارے میں جب تفصیلی بحث کی جائے گی تو اختلاف کا پایا جانا ایک ناگزیر امر ہوگا۔

(۸ جیسے کہ ہماری کائنات ایسے منفرد اجزاء اور منتشر اکائیوں سے مل کر بنی ہے جن کو ایک سطح پر جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی رنگا رنگی اسے مختلف میدانوں میں تقسیم کرتی ہے اور ہر ایک کے امتیازی حدود و قیود ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

بنی نوع انسان کی اکثریت اسی روش پر چل رہی ہے جس کی وجہ سے عام معاشرتی معاملات میں بھی سب الگ الگ چلتے ہیں اور افکار و نظریات میں بھی جدا جدا موقف اختیار کرتے ہیں۔ اور جب تک تمام بنی نوع انسان مکمل طور سے تمام باتوں میں متحد نہ ہو جائیں، ان لوگوں کو اتحاد کی کوئی بنیاد ہی نظر نہیں آتی۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کی کوشش ہے کہ اسلام کو بھی کئی حصوں پر اس طرح تقسیم کر دیں کہ کئی اسلام بن جائیں جو سب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں یا کلامی و فقہی اختلافات کو اس قدر بڑھا کر پیش کیا جائے کہ کفر و اسلام کی معرکہ آرائی میں تبدیل ہو جائے۔ (۹

یہ تو واضح ہے کہ حق ایک ہی ہے۔ لہٰذا تمام مذاہب برحق نہیں ہو سکتے۔ ایک حق پر ہوگا دوسرا باطل پر۔ اور باطل کی پیروی درحقیقت انکار حق کی نشاندہی کرتی ہے ——— ایسی صورت میں اگر فقہی و کلامی تفصیلات کو ہی ایمان کی بنیاد بنا لیا جائے تو پھر تفصیلات کا اختلاف ہی کفر و ایمان کا اختلاف بن جائے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جن مسائل میں اس مذہب کے رہنماؤں اور مفکروں نے لغزش کی ہے، ان کے لحاظ سے اکثر مذاہب میں کفر تفصیلی کی گنجائش موجود ہے۔ خواہ ان مفکروں اور رہنماؤں کو قابل معافی سمجھا جائے یا ناقابل معافی !! (۱۰

مذکورہ بالا تمہید کی روشنی میں یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسلام کو ان ہمہ گیر مفاہیم کے اعتبار سے پیش کریں جن کی قرآن مجید نے نشاندہی کی ہے کیونکہ یہی نقطۂ اشتراک بھی ہے' مرکز اتحاد بھی!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرون اولی کے مسلمان مسئلہ خلافت' نیز دیگر بہت سے اسلامی عقائد و مفاہیم اور فقہی قوانین میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے ایک دوسرے کی تکفیر کا ذریعہ نہیں بناتے تھے۔ بلکہ اختلاف نظر کے باوجود یہ گنجائش رکھتے تھے کہ شاید فریق مخالف کے ذہن سے مطالب مخفی رہے ہوں گے یا اس سے غفلت و نادانی ہوئی ہوگی' یا اس کی ذاتی روش اسے اس طرف لے گئی ہوگی یا ان اختلافات و چپقلش کی نذر ہو گیا ہوگا جو احساسات و شعور کو متاثر کر دیتے ہیں اور بعض اوقات موقف کو پیچیدہ بنا دیتے ہیں!!

اور اگرچہ ان کے درمیان خانہ جنگی بھی ہوئی اور باہمی کشیدگی بھی انتہا کو پہنچی' مگر ایسا دقیق معنوں میں فکری کجی کی بنا پر یا شعور و احساسات میں اثر کر جانے والے اختلاف نظر کی بنا پر نہیں ہوا۔ بلکہ حالات کی روش' نظام کے خلل اور تجربات میں بیداری کے فقدان کی وجہ سے ہوا)۔ ۱

امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے زمانہ میں اگرچہ مسلمانوں کی زندگی نہایت سخت اختلافات کے مرحلے سے گزر رہی تھی لیکن آپ کے ارشادات میں وحدت اسلامی کا وسیع و عظیم پیغام نظر آتا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ خلافت' امت مسلمہ کے درمیان اختلافات کی وہ بنیاد ہے جس نے مسلمانوں کی صفوں کو پراگندہ کر دیا۔ اسلامی پیکر کو متعدد ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ کیونکہ امامت و خلافت رسول کا ایک تعلق اگر عقیدہ سے ہے تو

دُوسرا تعلق اُن معاشرتی ذمّہ داریوں سے ہے جو نبیؐ کے جانشین کی حیثیت سے عائد ہوتی ہیں۔

لیکن دوسرے گروہ نے خلافت کو محض ایک انتظامی مسئلہ قرار دیا جس کا مقصد مسلمانوں کے معاملات کو ایک نہج پر چلاتے رہنا قرار پایا، جس کے لیے کسی ذاتی تقدس یا پارسائی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

❋

البتہ امیر المومنین علیہ السلام کی شخصیت مسئلہ خلافت کے لحاظ سے چکّی کے اُس قطب کی ہے جس کے بغیر وہ چل ہی نہیں سکتی۔ آپؑ ہی کے بارے میں آنحضرتؐ نے وصیّت فرمائی۔ اور (غدیر خم کے میدان میں) آپؑ ہی کی خلافت کے بارے میں ارشادِ ربانی کو حضورِ اکرمؐ نے اُمت کے سامنے پیش کیا۔ لیکن آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپؑ کو مسندِ خلافت سے دُور کر دیا گیا اور ۲۵ برس تک اغیار اس پر قابض رہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس پوری مدت میں امیر المومنینؑ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟

کیا وہ گوشہ نشین ہو کر محض خلیفہ کی غلطیاں شمار کرتے رہے یا آپؑ نے اسلامی دنیا میں مختلف مشکلات ایجاد کر کے حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی منصوبہ بندی کی ــــــــــ؟؟

کیونکہ یہاں مسئلہ حق و باطل کا ہے! تو کیا انھوں نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے باطل سے مکمل محاذ آرائی اختیار کی۔ چاہے اس کا کچھ بھی نتیجہ ہو۔ جیسا کہ آجکل بعض لوگوں کی روش نظر آتی ہے یا ماضی میں جن لوگوں کی وہ تائید کرتے ہیں ان کے طرزِ عمل سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک مصلحتِ وقت کوئی چیز ہی نہیں۔ بلکہ اسے وہ حق کے ساتھ خیانت قرار دیتے ہیں ــــــ!

یا یہ کہ مولاؑ نے ایک ایسی حکیمانہ عملی روش اختیار کی جو اس لحاظ سے نہایت متوازن تھی کہ جس کے ذریعہ حق کا اظہار و اعلان بھی ہو جائے، اپنی مظلومیت کے خلاف احتجاج بھی کر دیا جائے اور اسلامی دنیا میں داخلی طور سے امن و امان بھی برقرار رہے تاکہ وہ اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی رہے۔ مسئلہ درحقیقت اہم اور غیر اہم کا تھا کہ جس کا دائرہ کار اسلام اور مسلمانوں کے عمومی مفادات تھے۔ اور تمام مخلص ذمہ داروں پر یہ فریضہ ہمیشہ سے عائد رہا ہے کہ اگر ایک طرف (اظہار حق میں قوم کی) مکمل تباہی نظر آ رہی ہو اور دوسری طرف کچھ نقصانات برداشت کرتے ہوئے موقف کی سچائی کو واضح کرنے کے امکانات ہوں تو کون سی راہ اختیار کی جائے۔

؟ ؟ ؟

کہ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اسلامی ریاست کے بارے میں جو موقف اختیار کیا اگر اس کا دقیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپؑ نے مثبت عملی موقف اپنایا جس میں ملت مسلمہ کے اعلیٰ مصالح کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس وقت آپؑ کے پیش نظر جو بات تھی وہ اسلام کے وجود، بقا، طاقت، استحکام اور بیرونی عناصر سے تحفظ کی تھی۔ کیونکہ حضور اکرمؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اسلامی دنیا اپنے سب سے عظیم المرتبت قائد سے محرومی کے سبب کمزوری کا شکار تھی۔ اس لیے امیرالمومنینؑ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ ظاہری خلافت سے اپنی محرومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی منفی روش اختیار کریں جس سے امت مسلمہ کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے اور نہ آپؑ نے حکام جور سے اپنی ناراضگی کے سبب اسلامی شوکت کو کمزور ہونے دیا۔ نہ اپنے حق کی پامالی کو پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت

میں سدِ راہ بننے دیا۔۔۔ تاکہ کفار و مشرکین کی یلغار اسلامی عمارت کو زمین بوس نہ کر دے اور قیادت کا اختلاف امت کی تباہی کا سبب نہ بنے۔

❋

حضرت امیرالمومنینؑ کے نزدیک اسلام کا وجود ہر شے پر مقدم تھا چاہے اس کے وجود کو آپؑ کی شرعی قیادت نصیب ہو یا یہ سفیر خوار کسی اور آغوش میں پروان چڑھے!

البتہ اسلامی فکر، اسلامی شعور اور اسلامی بیداری کو بہرحال برقرار رہنا چاہیے، کیونکہ اگر بنیاد باقی رہے تو ہر قسم کے انحراف و کجی کو کسی نہ کسی وقت درست کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر اسلام کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے یا اس کا تشخص مٹنے لگے تو یہ زیادہ بڑا سانحہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں نہ نظام باقی رہے گا اور نہ قیادت کا کوئی تصور رہے گا۔

❋

امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے عظیم الشان موقف کو سامنے رکھ کر ہم "وحدتِ اسلامی" کے سلسلہ میں ٹھوس لائحہ عمل اختیار کر سکتے ہیں، اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم قوم کی بقا اور مذہب کے تحفظ کے لیے قدم اٹھاتے وقت امیرالمومنینؑ کے طرزِ حیات کا عمیق مطالعہ کریں اور ان سے زندگی کا سلیقہ اور بندگی کا طریقہ سیکھیں گے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آپؑ نے مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنایا تو انھیں ایک جامع دستور العمل بھی عطا فرمایا جو نہج البلاغہ کے اندر موجود ہے۔ جس میں آپ فرماتے ہیں کہ:

"۔۔۔ خداوند عالم نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

تمام جہانوں تک پیغام پہنچانے والا اور مسلمانوں کے معاملات کا نگراں و پاسبان قرار دیا۔ لیکن آپؐ کے تشریف لے جانے کے بعد مسلمان اختلاف کا شکار ہو گئے۔ بخدا ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آنحضرتؐ کے بعد اہلِ عرب اہلبیتِ پیغمبرؐ سے (دلی) منحرف ہو جائیں گے؟ اور مجھ سے کنارہ کشی اختیار کی جائے گی! ..... کس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ لوگ ابوبکر کی بیعت کر رہے تھے ..... لیکن جب میں نے یہ محسوس کیا کہ (ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کی گئی تو) یہ لوگ اسلام ہی سے پلٹ جائیں گے اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی لائی ہوئی شریعت ہی کو ختم کر دیں گے اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر میں دینِ اسلام کی مدد و نصرت نہ کروں تو اس کی عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ میری خلافت سے محرومی کی بہ نسبت یہ زیادہ اندوہناک بات ہو گی ..... تو میں ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ باطل کی یہ سازش بھی مٹ جائے اور دینِ خدا پر جو آفت ڈھائی جا رہی ہے اس کا سدباب کیا جا سکے۔"

(ملاحظہ ہو نہج البلاغہ مکتوب ۶۲)

❋

حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے اس فرمان میں پوری صورتِ حال کو نہایت واضح انداز میں آشکار کر دیا ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آپؑ نے جو سکوت کا موقف اختیار کیا اس کا راز کیا تھا؟ اور کس طرح آپؑ نے ردِّ اعداف

ہیں سے بلند ترین مدت۔ "دینِ اسلام کی بقا" کے لیے عظیم الشان جذبۂ قربانی کا مظاہرہ کیا اور اسلام کی تعلیمات کو زندہ رکھا۔ آپؑ کے اس فرمان رفیع الشان کے بعد ہر قسم کا گرد و غبار صاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقی تناظرِ صورت حال کی گہرائی کو دیکھتے ہوئے اپنے موقف میں لچک پیدا کرے تو لوگوں کو غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ دین و شریعت کے پیمانوں کو پیشِ نظر رکھ کر معروضی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

❋

آپؑ نے "اسلام کی بقا" کے اعلیٰ مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مکمل طور پر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور مسندِ خلافت کی حقیقی تصویر کو اجاگر کرنے کے بعد امورِ سلطنت سے کنارہ کشی کو اپنایا۔

لیکن حالات نے نیا رُخ اختیار کیا اور "تحریکِ ارتداد" نے زور پکڑا جس کے نتیجہ میں اسلام کا وجود ہی خطرے میں پڑتا ہوا نظر آیا۔ اور [illegible] دشمنوں کی ریشہ دوانیاں بھی بڑھتی نظر آئیں۔ اس موقع پر آپؑ نے مکمل کنارہ کشی کو ترک کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی طور پر کنارہ کشی بھی اسلامی مصالح کے تحت تھی اور اب اس کو ترک کرنے کی روش بھی اعلیٰ اسلامی مصالح کے ہی تابع تھی۔ اگرچہ ظاہر بین نگاہوں میں پہلے منفی موقف تھا اب مثبت۔ لیکن امیر المومنینؑ کی زندگی میں یہ دونوں باتیں مشیتِ پروردگار کے تابع اور اسلام کے اعلیٰ مصالح کے مطابق تھیں۔ جب کنارہ کشی ضروری تھی تو آپؑ نے کنارہ کشی اختیار کی اور جب اسے ترک کرنا ضروری ہوا تو ترک بھی کر دیا۔ کیونکہ اب دینِ اسلام کی بقا کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ آپؑ مکمل کنارہ کشی کو ترک کر دیں۔ اور یہ واضح ہے کہ امیر المومنینؑ کے تمام روحانی، فکری اور عملی اقدامات کا محور اسلام کے

اعلیٰ ترین مصالح تھے۔

آپؑ اگر آخر تک مکمل کنارہ کشی ہی اختیار کیے رہتے تو خارجی دشمنوں (کفار و مشرکین) کو جسارت پیدا ہو جاتی اور وہ اسلام کی عالیشان عمارت کو زمین بوس کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا سانحہ ہوتا جبکہ زمامِ سلطنت کا ہاتھ میں ہونا تو چند دنوں کی بات ہوتی ہے اور عمومی لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں ایک متحرک ذمہ داری کو ادا کرنا، اس کی فکری سطح کو بلند کرنا، اس کی توانائیوں کو ہر میدان میں بروئے کار لانا، ہمہ گیر حیثیت کا حامل ہے۔ اور اگر انسان اعلیٰ ترین منصب پر فائز نہ بھی ہو تو جس حد تک عملاً اس ذمہ داری کو پورا کرنا ممکن ہو، صاحبانِ احساس اپنے احساسِ مسئولیت کے تحت اُسے انجام دینا ضروری سمجھتے ہیں اور بنیادی مسائل کو حل کرنے میں اپنی توانائیاں بروئے کار لاتے ہیں۔

چنانچہ امیر المومنینؑ نے اسلام کی بقا اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے مثبت راہ اپنائی اور باطل قوتوں کی ان تمام ریشہ دوانیوں کو خاک میں ملا دیا جو اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی تھیں۔

آپؑ کے طرزِ عمل سے دینِ اسلام کی بنیادیں مستحکم ہوئیں ۔ اور تاریخی لحاظ سے یہ بات ثابت ہے کہ امیر المومنینؑ (کو اگرچہ منصبِ خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا مگر آپؑ) نے تمام فکری مسائل کو حل کیا، علمی گتھیوں کو سلجھایا خلفائے ثلاثہ کو جو دینی مشکلات پیش آئیں۔ خاص طور پر جنگ کے مراحل، اور دوسرے مواقع پر آپؑ نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے اسلام کو تقویت بھی حاصل ہو اور مسلمانوں کی آبرو بھی محفوظ رہے۔ اسلام کے بلند تر مقاصد کے تحت آپؑ نے ذاتی رنجشوں اور حکام کی غاصبانہ روش کی پروا نہ کرتے ہوئے

9 وہی مشورے دیئے جن سے دین و مذہب کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ جب خلیفۂ ثانی نے غزوۂ روم میں شرکت کے لیے حضرتؑ سے مشورہ لیا تو آپؑ نے فرمایا:

"خداوند عالم نے دین والوں کی حدوں کو تقویت پہنچانے اور ان کی غیر محفوظ جگہوں کو (دشمن کی نظر سے بچائے رکھنے کا ذمے رکھا ہے وہی خدا زندہ و غیر فانی ہے جس نے اس وقت بھی (دینداروں کی) مدد کی تھی جبکہ وہ اتنے تھوڑے تھے کہ دشمن سے انتقام نہیں لے سکتے تھے۔ اور ان کی اس وقت حفاظت کی جب یہ اتنے مختصر تھے کہ اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔

اب اگر تم خود ان دشمنوں کی طرف بڑھے، ان سے ٹکرائے اور کسی افتاد میں پڑ گئے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے دور کے شہروں کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا اور نہ تمہارے بعد کوئی ایسی پلٹنے کی جگہ ہوگی کہ اس کی طرف پلٹ کر آسکیں۔ (کیونکہ حکومت کا اعلیٰ عہدہ تو تمہارے قبضہ میں ہے) لہٰذا تم اپنے بجائے کسی تجربہ کار آدمی کو بھیجو اور اس کے ساتھ ایسے لوگوں کو روانہ کرو جن کی کارکردگی اچھی ہو اور جن میں خیرخواہی (پائی جاتی) ہو۔ اگر خداوند عالم نے غلبہ دے دیا تو ظاہر ہے کہ یہ اچھی بات اور ہم سب کی پسندیدہ بات ہوگی اور اگر صورتحال مختلف ہوئی تو تم لوگوں کے لیے ایک مددگار اور مسلمانوں کے لیے پلٹنے کا ایک مقام ہو گے۔"

(ملاحظہ فرمایئے نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۲)

اسی طرح جب خلیفۂ ثانی نے جنگِ فارس میں شرکت کے لیے آپؑ سے مشورہ طلب کیا تو فرمایا کہ:

• اس کام میں کامیابی و ناکامیابی کا دارومدار فوج کی کمی بیشی پر نہیں رہا ہے، یہ تو اللہ کا دین ہے جسے اس نے (سب دینوں) پر غالب قرار دیا ہے، اور اسی کا لشکر ہے جس کو اس نے تیار کیا ہے، اور اس کی ایسی نصرت کی ہے کہ وہ بڑھتے بڑھتے موجودہ حیثیت تک پہنچ گیا ہے اور پھیل کر اپنی موجودہ وسعت تک آگیا ہے۔ ہم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور اپنے لشکر کی خود ہی مدد کرے گا۔

امورِ سلطنت میں حاکم کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو (کسی ہار کے) دانوں کے درمیان ڈوری کی ہے جو انھیں سمیٹ کر رکھتی ہے۔ اگر وہ ڈور ٹوٹ جائے تو سب دانے بکھر جائیں گے اور پھر وہ سمیٹے نہ جا سکیں گے۔

آج عرب دنیا کے لوگ اگرچہ گنتی میں کم ہیں مگر اسلام کی وجہ سے وہ بہت ہیں اور اتحادِ باہمی کی وجہ سے فتح و غلبہ پانے والے ہیں۔ تم اپنی جگہ پر کھونٹی کی طرح جمے رہو اور عربوں کا نظم و نسق برقرار رکھو۔ ان ہی کو جنگ کی آگ کا مقابلہ کرنے دو۔ اس لیے کہ اگر تم نے اس سرزمین کو چھوڑا تو اطراف و جوانب سے بادیہ نشین تم پر ٹوٹ پڑیں گے، یہاں تک کہ تمھیں اپنے سامنے کے حالات سے زیادہ ان مقامات کی فکر لاحق ہو جائے گی جنھیں تم اپنے پیچھے غیر محفوظ شکل میں چھوڑ کر

گئے ہوں گے۔ کل اگر عجم والے تمھیں دیکھیں گے تو (آپس میں) یہ کہیں گے کہ: "یہ ہے سردارِ عرب!" پھر اگر تم نے ان کا قلع قمع کر دیا تو تم آسودہ ہو جاؤ گے مگر اس کی وجہ سے ان کی حرص و طمع تم پر زیادہ ہو جائے گی۔

اور یہ جو تم کہتے ہو کہ وہ لوگ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے چل کھڑے ہوئے ہیں۔ تو اللہ ان لوگوں کے آگے بڑھنے کو تم سے زیادہ بُرا اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے۔ اور وہ جس بات کو ناپسندیدہ سمجھے اسے بدلنے (اور روکنے) پر بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

اور تم ان لوگوں کی تعداد کے بارے میں جو کہتے ہو (کہ وہ بہت زیادہ ہیں اسلامی لشکر کیسے اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کرے گا) تو (یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ) ہم ماضی میں کثرت کی بنا پر نہیں لڑا کرتے تھے بلکہ اللہ کی تائید و نصرت کا سہارا ہوتا تھا۔"

(ملاحظہ ہو نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۴۴)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات میں ہمیں اسلامی وحدت کی حقیقی عملی جنبش نظر آتی ہے ورنہ عام دنیاوی حالات میں اور جب دو شخصیتوں کے درمیان قیادت کے مسئلہ پر سنگین اختلافات ہوں تو صورتِ حال یہ نظر آتی ہے کہ ہر فریق دوسرے کے مخالف روش اختیار کرتا ہے، اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے عناصر اور حالات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جن سے فریق مخالف کی زندگی خطرے

میں پڑ جائے۔ کم از کم یہ تو ضرور ہی کرتا ہے کہ جب فریق مخالف کو خطرے کا سامنا ہو تو اتفاق بن جاتا ہے کیونکہ یہ اتفاق بھی فریق مخالف کو راستے سے ہٹانے میں کارگر ہو سکتی ہے اور اس کا راستے سے ہٹنا اس کے لیے مسند اقتدار پر بیٹھنے کا موقع فراہم کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب مرکزی قیادت کے بارے میں نقطۂ نظر کا اختلاف صرف ذاتی مفاد پر مبنی نہ ہو بلکہ فریق ثانی کا تسلط غیر قانونی بھی ہو اور شرعی لحاظ سے ناقابل قبول بھی۔ تو اس صورت میں مسئلہ ذاتی ذمہ داریوں کی حدود میں آجاتا ہے اور بادی النظر میں یوں نظر آتا ہے کہ فریق مخالف کو ہٹا دینا ہی قرین مصلحت ہے تاکہ حق حکومت اس کے سچے حقدار کو مل جائے، شرعی لحاظ سے بھی، مسلمین کے مفاد کے لحاظ سے بھی!

لیکن امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا انداز فکر کچھ اور تھا۔ وہ مسئلہ کو معتبر بنا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ ان کی گہری نگاہ حقائق کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ رہی تھی۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ابھی ماحول اس بڑی تبدیلی کے لیے سازگار نہ ہو۔

دوسری طرف یہ امکان بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ:

روم و فارس کی سلطنتیں، جو اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن تھیں ان کی فوجی طاقت کے مقابلے میں خلیفۂ وقت کی ہلاکت و بربادی، اسلام کی موقعیت کے لحاظ سے نقصان دہ ہوتی۔ جس کا منفی اثر یہ ہو سکتا تھا کہ خود اسلام کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔

کفار کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ مسلمانوں کی مسند حکومت پر جو شخص بیٹھا ہے اس کی ذاتی خصوصیات کیا ہیں۔ ان کے لیے تو وہ اسلامی شوکت کا نمائندہ تھا۔ (جس کی ہلاکت کفار و مشرکین کی مسرت و شادمانی کا سبب بنتی) اس لیے صف اوّل کے قائدین پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ ایسے موقع پر ثانوی خصوصیات

سے بلند ہو کر خود اسلام کو بچائیں، اور اسلام کی حفاظت کے لیے اس شخص کی بھی حفاظت کریں اور ان مخصوص حالات میں اسے منظر سے نہ ہٹنے دیں۔ کیونکہ یہ شخص اس وقت ہلاک ہو گیا تو اسلامی شوکت کو نقصان پہنچے گا لہٰذا اسلامی شوکت کی حفاظت کے لیے اس شخص کی بھی حفاظت کی جائے گی۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام اگرچہ اس وقت اسلامی حکومت کی قیادت سے محروم تھے لیکن اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے پاسباں کی حیثیت سے انھوں نے اسی موقف کو اختیار کیا۔ قیادت کا مسئلہ پاسبانی و نگرانی سے مربوط ہے چنانچہ آپؑ نے ہر موقع پر اسلام کی حفاظت کو مدنظر رکھا اور وہ تمام معاملات جن میں مشیروں کی وجہ سے خلیفۂ وقت کو پسپائی ہو سکتی تھی، ان میں آپؑ نے مداخلت فرمائی اور کسی بھی معرکہ میں نبرد آزمائی کے لیے جس روحانی عنصر کی ضرورت ہے اس کو امام عالی مقامؑ نے پیش نظر رکھتے ہوئے خلیفۂ وقت کی بروقت رہنمائی فرمائی جیسا کہ آپؑ کے اس جملے سے مترشح ہے کہ :

"خداوند عالم کو یہ پسند نہیں ہے کہ تم بھی ان لوگوں کے ساتھ نکلو۔"

یا اسی طرح آپؑ کا یہ فرمانا کہ :

"ہم لوگ خدا کی مدد و نصرت کے سہارے جنگ کرتے تھے نہ کہ افواج کی کثرت کے ذریعہ!"

❋

اور یہ ہے اسلام کی وہ عملی روش جس میں نظریات کا اختلاف مسائل کو الجھانے کا سبب نہیں بنتا بلکہ اسلام کے بلند تر مقاصد اس روش کی بنیاد ہوتے ہیں اور تمام منصوبے اور تمام راہیں اسی کی خاطر اپنائی جاتی ہیں تاکہ ہر موقع پر اسلام

کے آفاقی مصالح کو مدنظر رکھا جائے چاہے اس کے لیے طریقۂ مثبت اختیار کرنا ہو یا منفی! اور اسلام کے ارفع مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں ذاتی، شخصی یا مختصر مواقع کے مفادات کو نظر انداز کر دیا جائے۔

حاصل امیر المومنینؑ کے اس موقف کی روشنی میں ہم سیاسی، سماجی، فکری اور تبلیغی میدان میں اسلامی اسلوب حیات کا ایک عمومی قانون تشکیل دے سکتے ہیں۔ اگر ہمارے نظریاتی حریف کی پوزیشن ایسی ہو کہ اس کی کمزوری خود اسلام کی کمزوری کا مظہر بن جائے تو ایسی صورت میں اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہمیں اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُسے دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اور یہ بات اسی حد تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ تمام سماجی، ثقافتی اور تبلیغی مراحل میں اسے پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جب بھی دشمنان دین اور منحرف طاقتیں ہمارے داخلی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے گوناگوں وسائل کو کام میں لاتے ہوئے اسلام کے فکری یا اقتصادی موقف کو کمزور کرنے کی کوشش کریں، تو ہم پر یہ فرض ہو جائے گا کہ ہم اسلام کے بلند تر مقاصد کو پیش نظر رکھیں (اور ضرورت ہو تو) ان بیشتر وسائل کو منجمد کر دیں جن کی وجہ سے دشمن طاقتیں ہماری طرف غلط نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔ اور ایسے ابتدائی اقدامات کریں جن سے اسلامی وحدت آشکار ہو رہی ہو، کیونکہ ان باتوں سے اسلامی قوت کو زندگی ملے گی۔ ختم

✻

۱۱ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے بعض ارشادات میں یہ تاکید بھی پائی جاتی ہے کہ مذہبی اور فکری اختلافات کی صورت میں پرجوش افراد جو سخت روش اختیار [illegible] ہیں ان سے اجتناب کیا جائے تاکہ انسان نفس کے ہیجان اور باطن میں چھپے ہوئے عناد سے متاثر ہو کر کوئی اقدام نہ کر بیٹھے۔ اسی طرح (دشمنان دین پر لعنت کی اجازت کے باوجود)

اُن کو گالی دینے یا تعریض کا ایسا انداز اپنانے سے منع کیا گیا ہے جو بازاری ذہنیت کی عکاسی کرتا ہو۔ اگرچہ وہ عرفِ عام میں گالی کی حدود میں نہ بھی آتا ہو۔(1

2) امیر المومنین نے (دشمنانِ دین کو بھی) دشنام سے اس لیے منع کیا کہ آپؑ اسے پسندیدہ صفات میں سے نہیں سمجھتے اور یہ باہمی محبت اور (انسانی) احترام کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ اس سے کوئی مثبت فائدہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ عمل موقف (کی سچائی اور دشمن) پر غلبہ حاصل کرنے میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات 'دشنام طرازی' ہیجان کی طرف لے جاتی ہے اور دوسرا پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے پھر متقابلہ کا ارادہ بڑھ جاتا ہے اور ذاتیات اس قدر دخیل ہو جاتی ہیں کہ اگر اصل مسئلہ قومی و سیاسی بھی رہا ہو تو وہ شخصی و انفرادی بن جاتا ہے۔(2

اور بعض اوقات باہمی دشنام طرازی شروع ہو جاتی ہے اور ردِ عمل کے طور پر گفتار کی جنگ، رفتار کی جنبش پر غالب آنے لگتی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے بلند تر اہداف کے حصول سے عاجز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

"اور خبردار تم لوگ انھیں برا بھلا نہ کہو جن کو یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں کہ اس طرح یہ دشمنی میں بغیر سوچے سمجھے خدا کو برا بھلا کہیں گے، ہم نے اسی طرح ہر قوم کے لیے اس کے عمل کو آراستہ کر دیا ہے۔"

(سورہ انعام ۶ - آیت ۱۰۸)

توجیب دشنام کی روش کو اس قدر سختی سے روکا گیا ہے کہ مشرکین کو بھی دشنام دینے کی اجازت نہیں ہے چہ جائیکہ مومنین و کافرین باہمی تنازعات میں گالی پر اتر آئیں، اور ایک دوسرے کو یا ایک دوسرے کی قابلِ احترام چیزوں کو گالی دینے لگیں۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں بات یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ وہ خدا ہی کو گالی دینے لگیں

جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اسلام کے نزدیک تو نام خدا بھی محترم ہے اور کوئی بھی ایسی ہیجان انگیزی جو اس کے نام گرامی کے ساتھ بے ادبی کبھی جائے اس سے دور رہنا ضروری ہے۔

❋

اور جب کفار و مشرکین کو برا بھلا کہنے سے اتنی سختی سے منع کیا گیا ہے تو اسلامی دائرہ میں کیسے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ باہمی اختلافات ان دشنام طرازیوں کی طرف کھینچ لے جائیں کہ باہمی نظریاتی اور فکری اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کی قابل احترام چیزوں اور اسلامی شعائر پر ہی دشنام طرازیوں کی بوچھار کر دی جائے۔ یہ ان کے شعائر کی توہین کریں یا وہ ان کے شعائر کی بے ادبی کریں بلکہ یہی اسلامی ماحول کی خدمت تو نہ ہو گی جو ہم سے یہ تقاضہ کرتا ہے کہ ہم اپنی فکری سطح اور روحانی تعلقات کی سطح کو اس قدر بلند کرلیں کہ ہمارے درمیان اخوت، تعاون اور باہمی میل جول کے راستے ہمیشہ کھلے رہیں۔ جنگِ صفین کے موقع پر جب حضرت امیرالمومنینؑ نے سنا کہ آپؑ کے کچھ ساتھی دوران جنگ شامیوں پر سب و شتم کر رہے ہیں تو آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ:

"میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تم گالم گلوچ کرو۔ لیکن اگر تم ان کے برے کردار کا تذکرہ کرو تو بے شک یہ مناسب ہے اور مقام عذر میں بلیغ تر اور رسا تر ہے اور بہتر یہ ہے کہ انہیں سب و شتم کرنے کی بجائے یہ کہو: بارِ خدایا! ہمارے اور ان کے خون کو بہنے سے بچا، ہمارے اور ان کے مابین صلح کرا دے۔ انہیں ان کی گمراہیوں سے حق کی طرف ہدایت فرما تاکہ جو حق کو نہیں جانتا وہ اسے پہچان لے اور جو حریص و شیفتہ گمراہی اور دشمنی ہو وہ اسے اس (غلط اور ناروا کام) سے

Presented by www.ziaraat.com

باز رکھو ۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۷)

مذکورہ بالا ارشادِ گرامی پر ایک سرسری نگاہ بھی اس حقیقت کو عیاں کرنے کے لیے کافی ہے کہ امیر المومنینؑ کو یہ پسند نہیں تھا کہ دوسروں کے مقابلہ پر اپنے منفی موقف کو لوگوں کے سامنے گالی کے اسلوب میں پیش کیا جائے۔ کیونکہ اس کا کوئی اچھا نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہو سکتا، خصوصاً مسلمانوں کے باہمی اختلافات میں تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ طریق کار تو اس امکانی فکری گنجائش و موافقت کے بارے میں غور و فکر کی راہیں بھی مسدود کر دیتا ہے۔ جسے آخر کار، تمام وسائل استعمال کرنے کے باوجود بنیادی مقصد کے طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

13. امام عالی مقام حضرت امیر المومنینؑ اپنے ساتھیوں یا دیگر مسلمانوں سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ وہ دشمن سے مقابلے کے موقع پر منفی موقف اختیار کرتے ہوئے اس سے مخالفت کے موقع پر بالکل ساکت و جامد ہو جائیں۔ کیونکہ ایسا کرنا بسا اوقات مقابلے کے موقع پر عملی لحاظ سے صحیح نہیں ہوتا۔ اور دوسروں کے سامنے مخالف کے مقابلے میں اپنے موقف کی سچائی کو واضح کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے ساتھیوں کو توجہ دلائی کہ وہ دوسرا اسلوب اختیار کریں، مخالف کے مقابلے میں اپنے موقف کی سچائی و پاکیزگی کو لوگوں کے سامنے واضح کریں اور خوشنودیٔ پروردگار ان کے تعلقات میں جو روحانیت کی لہریں کارفرما ہیں اور ان کے ذاتی شعور و ادراک میں جو نفسیاتی و انفرادی احساسات کا مزاج ہے اُسے آشکار کریں۔ یہ چیز ایسی ہے جو مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور گوناگوں مسائل کو طے کرنے کے سلسلے میں ایک عملی قاعدہ اور باشعور روحانی روش بن سکتی ہے۔ 13

جب بھی مسلمانوں میں بعض ایسے مسائل میں اختلاف ہو جنہیں ہر فریق موقف یا نظریہ سے انحراف سمجھتا ہو تو ہر ایک کو اپنے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے

یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی رائے پیش کرے اور فریقِ مخالف کے جن کاموں کو صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا پائے اُن کو آشکار کرے۔ ان کی اس کیفیت کی نشاندہی کرے جو مردِ مسلمان کی آئیڈیل اور پسندیدہ صورتِ حال سے مختلف ہو۔ تاکہ لوگوں کو نئے نقطۂ نظر کی روشنی میں صحیح راستے کو پہچاننا ممکن ہو سکے۔ اور وہ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ ہم نے جنگ یا صلح کے موقع پر اُن کے موقف سے الگ جو موقف اختیار کر رکھا ہے، یہی صحیح ہے۔ اور ہم اُن کی مخالفت کرنے پر مجبور ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک صحیح موقف کے سلسلہ میں بلیغ اور حق بجانب عذر ہوگا۔

یہ روش لوگوں کو آمادہ کرے گی کہ وہ ہر موقف کا باریک بینی سے جائزہ لیں۔ اور دونوں باتوں میں سے درست موقف کو اختیار کریں۔ اسی طرح اس روش کو اختیار کرنے سے ایک عمومی مفاہمت کی فضا بھی پیدا ہوگی جو دوسروں کو آمادہ کرے گی کہ وہ اپنے عقائد کے سلسلہ میں جن باتوں کا دفاع ضروری سمجھتے ہوں، ان کے لیے یہی طریقہ اختیار کریں، اپنے موقف کے دفاع کے لیے مخالفین کی کارکردگی اور صورتحال کو واضح کریں تاکہ لوگوں کے لیے حقیقت کو سمجھنے اور مل بیٹھ کر مسائل کو سلجھانے کی راہ ہموار ہو سکے۔

❋

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان میدانِ مبارزت میں دھیمی رفتار سے چلے۔ خصوصاً جب حالات نفسیاتی ہیجان، ذاتی پیچیدگیوں اور مزاج کے ردِ عمل کے طور پر جنگ و جدال تک کھینچ لے جائیں، جو بعض اوقات عداوتوں کو بڑھا دیتے ہیں، دلوں کو کینے سے بھر دیتے ہیں اور عملی زندگی کی کھینچا تانی میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں ایسے میں تو انسان کے لیے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ اسلامی روح کو اپنا لے۔ اسی روح کے ساتھ بارگاہِ معبود تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسی کے سامنے گڑگڑائے کہ وہ ان مسلمانوں پر اپنی خصوصی رحمت نازل فرمائے جو آپس میں اختلاف رکھتے ہیں یا برسرِ پیکار ہیں۔ بلکہ پروردگارِ عالم ان

کے درمیان رحمت، محبت، کشادگی اور سلامتی کی نئی روح پھونک دے، جس کے نتیجہ میں ہماری جان بھی محفوظ رہے، دوسروں کا خون بھی نہ بہے، جنگ رک جائے اور ایسے تبادلۂ خیالات کی گنجائش پیدا ہو جائے جس کی اساس و بنیاد حق و حقیقت تک پہنچنے کا جذبہ ہو۔ ہمارے باہمی معاملات کی اصلاح ہو جائے، ہم ان مشترک معاملات کو سمجھنے لگیں جو عقائد، نظریات اور ان عمومی مصالح میں پائے جاتے ہیں جو درحقیقت کفر اور کفار کے کے مقابلے میں اسلام اور تمام مسلمانوں کے مصالح و مفادات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور خدا سے یہ بھی دعا کریں کہ ان لوگوں کے عقائد میں جو گمراہی ہے اسے دور کرکے انھیں ہدایت کے راستے پر لائے، ضلالت و گمراہی کے دروازوں کو بند کرکے ان کے سامنے ہدایت کے دروازوں کو کھول دے اور نہایت قریبی راستے سے انھیں حق کی پیروی پر آمادہ کر دے تاکہ وہ ایسی پرسکون فضا میں جو نفس کو اطمینان و کشادگی عطا کرتی ہے دل کی وسعت کے ساتھ حق و باطل میں امتیاز پیدا کرسکیں، تاکہ انسان حقائق کا ان کی روشن اور واضح راہوں سے ادراک کرسکے اور نافرمانی و سرکشی سے محفوظ رہ سکے ---- اور ایسی صورت حال پیدا نہ ہو کہ کسی موقف کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں مقابل سے دشمنی اس کے افکار پر مسلط ہو جائے اس کے لیے ہمیں اپنے اندر تبدیلی پیدا کرکے اخوت و بھائی چارے کی روح کو پیدا کرنا ہوگا جس کی بنیادوں میں دوسروں سے الفت و محبت ایک کلی قانون کی طرح سموئی ہوئی ہوتی ہے جیسا کہ امیرالمومنینؑ سے منقول ہے کہ:

«احصد الشر من صدر غيرك بقلعه من صدرك۔»

"دوسرے کے سینے سے کینہ و شر کی جڑ اس طرح کاٹو کہ خود اپنے سینہ سے اسے اکھاڑ پھینکو" (کلمات قصار ۱۷۸)

اگر انسان اپنے دل و دماغ کو شر کے تمام افکار و تصورات سے پاک کرسکے تو

وہ اس بات پر قادر ہوگا کہ اپنی تمام کارکردگیوں میں متوازن اور شائستہ روش اختیار کرسکے، جس کے نتیجہ میں فریق مخالف کے اندر بھی نیکی کے تصورات پیدا ہوسکتے ہیں جیسا کہ معاشرتی زندگی میں "عمل اور ردعمل" کے فطری قانون اور لوگوں کے باہمی تعلقات کے اسلوب سے پتہ چلتا ہے۔

❋

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام جو مردِ مسلمان کی شخصیت میں اس روح کو ایجاد کرنا چاہتے تھے اور دلوں میں بھڑکتی ہوئی عداوت کی آگ کو بجھانا چاہتے تھے، وہ اس بات کی تائید نہیں کرتے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافی مسائل کو بالکل ہی نظرانداز کردیا جائے، یا ان کی طرف سے غفلت اختیار کی جائے۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں فتنہ و فساد، ایک نئی محاذ آرائی اور فکری اضطراب پیدا ہوسکتا ہے۔ اور افکار و خیالات اگر زیر زمین چلے جائیں، لوگوں کی اندرونی دنیا کا خیال نہ کیا جائے اور فکری بےچینی کو نظرانداز کرکے اگر کوئی فیصلہ کیا جائے تو اس کی بنیاد پر جو وحدت پیدا ہوگی وہ مجبوری بنیادوں پر قائم ہوگی اس میں سچائی اور دوستی کی بنیاد نہیں ہوگی۔

امیرالمومنین تاکید فرماتے تھے کہ مسلمان اپنے عقائد و احکام میں حق اور اسلام کے ساتھ اخلاص کی روش اپنائیں، اور ان میں آپس میں جو بھی اختلاف رائے ہو اس میں اصل تمنا حق تک پہنچنے کی ہو، جو بحث و مباحثہ ہو اس میں حکمت اور موعظہ حسنہ کے اصول کارفرما ہوں۔ سب لوگ خدا و رسولؐ ہی کی طرف رجوع کریں۔ انہی کے ارشادات کی روشنی میں باہمی مسائل کا فیصلہ کریں۔ فکری معاملات کی علمی انداز میں تحقیق کریں۔ ان میں ذاتیات کو دخل اندازی کا موقع نہ دیں، تاکہ ایک طرزِ فکر دوسرے طرزِ فکر کے مقابلے پر آئے، نہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے پر کیونکہ لوگوں کے گروہ ایک دوسرے سے برسرِپیکار ہوتے ہیں تو عام طور سے اختلاف کی صورت میں ذاتی مفادات بنیادی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔

اس کی روشنی میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ اختلافی مسائل بھی ایک دوسرے سے دوری، دشمنی یا جنگ و جدال کا سبب نہیں بنیں گے بلکہ پرسکون علمی اور منطقی انداز میں ان پر علمی بحث ہو سکے گی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بحث و مباحثہ کے لیے ہدایت کی گئی ہے کہ نہایت شائستہ ہونی چاہیے اور مخالف کی بات کو نہایت عمدہ طریقہ سے رد کرنا چاہیے۔

جیسا کہ ہم حضرت امیر المومنینؑ کے خطبوں، ارشادات اور حکیمانہ کلمات میں دیکھتے ہیں کہ انھوں نے خلافت جیسے حساس مسئلہ پر اپنے حق کے اظہار اور مخالفین کے موقف پر تنقید کرتے ہوئے مختلف مقامات پر مختلف انداز سے گفتگو فرمائی ہے تاکہ لوگ کسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہونے یا کسی پیچیدگی میں پڑنے کی بجائے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کریں۔ اسی طرح جن مسائل میں لوگوں کے درمیان اختلاف نظر ہوتا تھا ان پر بحث و تحقیق کے لیے آپؑ فکری روش کو اپنانے کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ اسلامی اجتہاد کا عمل مکالمہ اور تبادلہ خیالات کی ایک ایسی روش پر جاری و ساری رہا ہے جس کے دروازے ہر قسم کے مسائل کے لیے حتیٰ کہ ان مسائل کے لیے بھی کھلے رہے جو عام پبلک کے لیے نہایت حساس ہوتے ہیں تاکہ بحث و مباحثہ کو کسی دائرے میں پابند نہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر کوئی فکری مسئلہ عقیدہ بن کر دلوں میں زندگی گزار رہا ہے تو اسے ذہن سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

کسی مسئلہ میں ذہن کے مطمئن ہونے، کچھ باتوں کے پابند ہونے اور کسی نظریے سے نسبت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عمومی بنیادوں پر تفصیل سے بحث اور جستجو کی جائے۔ تاکہ جو زندہ ہے اس کے پاس دلیل موجود ہو اور جو ہلاک ہو رہا ہے اس پر اتمام حجت کی جا چکی ہو۔

۱۶ چنانچہ خطبہ شقشقیہ میں آپؑ نے مسئلہ خلافت کو سامنے لا کر مختصر الفاظ میں اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال دی، تاکہ خلافت کے بارے میں لوگوں کے سامنے آپؑ کا موقف واضح ہو جائے اور آپؑ نے اپنے نقطہ نظر کے اسلوب کو لوگوں کے سامنے روشن

Presented by www.ziaraat.com

کر دیا تاکہ وہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ مسئلہ ذاتی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ تحفظِ رسالتؐ کا مسئلہ ہے جو احساس فرض کے راستے پر گامزن ہو کر یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ:

• خداوندِ عالم نے علماء پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ ظالم کی چیرہ دستی اور مظلوم کی تہی دستی و محرومی پر خاموش نہ رہیں، اور جب ضروری اور مناسب طاقت و قوت میسر ہونے کی بنا پر حجت قائم ہو چکی ہو تو ہر قسم کے ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ ~~~ (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳)

اس مسئلہ کے کچھ آثار ہمیں آپؑ کے ان ارشادات میں بھی نظر آتے ہیں جو آپؑ نے دعائیہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ گویا اس قضیہ کو خداوندِ عالم کی بارگاہ میں لے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بڑے بڑے معاملات کے سلسلہ میں ان ذمہ داریوں کا دروازہ کھول دیتا ہے جو خداوندِ عالم نے بندوں پر عائد کی ہیں۔ اسے دعا کے طور پر پیش کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں کو ان معاملات کی اہمیت کا اندازہ ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ بات ذاتی مفادات کی نہیں ہے بلکہ رسالت و شریعت کی ہے۔ لوگ اسے اسی انداز میں پرکھیں اور آفاق کی وسعتوں میں بلندی حاصل کریں۔ چنانچہ نہج البلاغہ میں آپؑ فرماتے ہیں:

• بارِ خدایا! تو آگاہ ہے کہ جو کچھ ہم نے کیا وہ اس لیے نہ تھا کہ ہم سلطنت و خلافت کی طرف میل و رغبت رکھتے تھے، نہ اس لیے تھا کہ متاعِ دنیا سے ہم کچھ حاصل کرتے بلکہ صرف اس لیے تھا کہ جب فتنہ و فساد اور ظلم و ستم ظاہر ہوا اور حلال و حرام میں تغییر شروع ہوا تو تیرے دین کے آثار میں (جو تغیر ہو گیا تھا ہم نے چاہا کہ) اسے واپس لائیں، اور تیرے شہروں میں اصلاح و آسائش

کو برقرار کر دیں تاکہ تیرے ستم کشیدہ بندے امن و آسودگی حاصل کرلیں اور تیرے احکام جو ضائع کیے جا رہے تھے پھر جاری ہو جائیں۔

بار خدایا! میں وہ سب سے پہلا شخص ہوں جس نے حق کی طرف رجوع کیا، حق کی دعوت سنی اور حق کی صدا پر لبیک کہا اور رسول اللہؐ کے علاوہ کسی نے مجھ سے پہلے نماز نہیں پڑھی۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۱)

۱۹ اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مسئلہ تحکیم میں خوارج سے اپنے اختلاف کے بارے میں بھی تمام تفصیلات پیش کر کے ان کے ساتھ بحث پر بھی آمادہ تھے تاکہ اپنے موقف کے بارے میں حجت و دلیل کو نمایاں کر سکیں جیسا کہ طلحہ، زبیر اور معاویہ کے ساتھ آپؑ کے طرز عمل میں بھی یہ بات صاف نظر آتی ہے۔ اور آپؑ نے ان لوگوں سے جو جنگ کی وہ فکری بنیاد پر نہیں بلکہ اسلامی معاشرے میں نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے اور لوگوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی تاکہ اسلامی دنیا اندرونی خلفشار اور ابتری سے بچی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؑ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خوارج کے بارے میں خطاب فرمایا تو ان کو قتل کرنے سے منع کیا، کیونکہ نہروان میں آپؑ نے ان لوگوں سے اس وجہ سے جنگ نہیں کی تھی کہ وہ آپؑ سے اختلاف رکھتے تھے۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کو تاراج کر رہے تھے۔ چنانچہ آپؑ نے جنگ نہروان کے بعد ارشاد فرمایا کہ:

"میرے بعد خوارج سے جنگ نہ کرنا کیونکہ جو شخص حق کا طلبگار ہو اور خطا کر بیٹھے وہ اس شخص کے مانند نہیں جو باطل کا طلبگار ہو اور اس کے لیے کوشاں ہے۔" ۱۹

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۹)

امیر المومنینؑ مسئلہ کو اس بنیاد پر حل کرتے ہیں کہ جو لوگ حق کے طلبگار ہو کر خطا کے مرتکب ہو جائیں ان سے اس وقت تک بحث و گفتگو کرتے رہنا چاہیے جب تک ان میں ذاتی طور سے حقیقت حال تک پہنچنے کی آرزو برقرار رہے۔ کیونکہ اس صورت میں دونوں کی مشترکہ کوشش صحیح رائے تک پہنچنے کی ہوگی۔ لیکن جو لوگ باطل کے طلبگار ہیں اور اسی راہ پر چل رہے ہیں وہ چونکہ غلطی میں نہیں ہیں بلکہ عداوت و عناد کے ساتھ حق کے مقابلہ میں اپنی پوری طاقت استعمال کر رہے ہیں ایسے لوگ کبھی بھی صحیح بحث و مباحثہ کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے، بلکہ ہمیشہ دھوکہ دہی سے کام لیں گے تاکہ ان کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے مواقع مل سکیں۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے یا دعویٰ کرتے ہیں اس میں حق و باطل کی جستجو قطعاً ملحوظ نہیں ہوتی ہے۔

ط حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے معروضی حالات میں اسلامی وحدت کے لیے جو اسلوب مقرر فرمایا ہے اس کے بعض نشانات کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا۔ آپ کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو جو داخلی اور خارجی سطح پر سخت قسم کے چیلنج کا سامنا ہے اس کے پیش نظر پوری اہمیت مثبت روش کو حاصل رہے، میدان عمل میں موجود ہر گروہ کی موافقت حاصل کی جائے۔ عہد و پیشکشیں کی جائیں، محاذ آرائی ترک کی جائے، نرم روش اپنائی جائے بڑے مفاد کی خاطر چھوٹی مصلحتوں کو قربان کیا جائے۔ خاص فکری اور سیاسی پہلوؤں کی حفاظت کی جائے اور باہمی اختلافات پر بحث و مباحثہ کی راہ ہموار کی جائے لیکن ایسے اسلوب سے کہ جو عمومی مفاد کے استحکام اور جاری معاملات کو ٹھیس نہ پہنچائے بلکہ مسلمان اس راہ پر چل سکیں جس میں اہم ترین مفاد کی سلامتی کے لیے موقف کی یگانگت نظر آئے اور فکری معاملات کے گوناگوں پہلو برقرار رہیں جن میں لوگوں کی آراء مختلف ہوتی ہیں اور یہی باہمی بحث و مباحثہ کا موضوع ہیں۔

ط حضرت امیر المومنینؑ کی زندگی میں اس عملی اسلوب کی ظاہری قدر و قیمت

یہ نظر آتی ہے کہ خلافت کے مسئلہ میں مختلف نقطۂ نظر کے باوجود دنیائے اسلام کے اندر آپؑ
کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ آپؑ ایک مؤثر شخصیت کے مالک تھے، آپؑ کی شخصیت دوسروں
سے متاثر نہ تھی۔ لوگوں نے آپؑ کے حق کی ادائیگی سے اختلاف کیا، خود کو منصب کا حقدار
سمجھا لیکن آپؑ کی عظمت ہر ایک نے تسلیم کی۔ آپؑ نے اپنے دور میں جو اسلوب اپنایا وہ مسئلہ
کی انتہائی گہرائیوں سے وابستہ تھا۔ دوسروں کی طرف سے اپنے معاملات میں اختیار کیے
جانے والے موقف کی مانند نہیں تھا کیونکہ دوسرے لوگ عام طور سے شخصی مفاد ملحوظ رکھتے ہیں
آپؑ نے اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی مفاد پیش نظر رکھا۔ اور یہی وہ بات ہے جو ان تمام
مسلمانوں کو جو آپؑ کے موقف سے وابستہ اور آپؑ کے حق پر ایمان رکھتے ہیں یہ تاکید کرتی
ہے کہ وہ دین اسلام کے مفاد کی خاطر، وحدت اسلامی کے مسئلہ میں اعلیٰ و ارفع فکری شعور
اور ذہنی بیداری سے کام لیں اور اپنے موقف کی بنیاد اسی طرز فکر کو قرار دیں اور اپنے تمام
اقدامات و تجربات میں سب کے ساتھ چلتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ ان کا نعرہ یہ ہونا چاہیئے کہ:

"میں اس وقت تک ناگوار حالات کو برداشت کروں گا جب تک
مسلمانوں کے معاملات محفوظ ہیں۔"

اسی نعرہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور صراط مستقیم سے انحراف کو اپنی
زندگی سے خارج کر دیں۔

اسلامی وحدت کے سلسلہ میں "اہلبیت طاہرینؑ" کے موقف کو درست طریقے سے
سمجھنے کے لیے ہم امام چہارم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے اس طرز عمل پر غور کریں جو
انھوں نے اسلام کے عظیم مفادات کی خاطر عملی اور روحانی طور سے اپنایا جو ان کی تعلیمات سے
دور نظر آتا ہے جو ان بدترین حالات کے رد عمل کے طور پر پیدا ہو سکتے تھے جن سے آپؑ کو بنی امیہ
کے عہد میں گزرنا پڑا۔ کربلا کا وہ خونی معرکہ پیش آیا جس میں آپؑ کے پدر بزرگوار، بھائیوں،

قرابتداروں، اہل خاندان اور اعوان و انصار کو ایسے المناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا جو انسان کے احساسات و جذبات کو رنج و غم سے بھر دینے کے لیے بہت کافی ہیں پھر اہلبیت عصمت و طہارت کی اسیری اُن کا قیدیوں کی حیثیت سے شام لے جایا جانا، آپؑ کا پابند سلاسل کیا جانا۔ ایسے اندوہناک واقعات ہیں کہ فطری طور پر ان کا آپؑ پر اثر تھا جس کی وجہ سے آپؑ واقعہ کربلا کے بعد چونتیس برس تک گریہ و بکا کرتے رہے۔ اور یہ بالکل فطری بات ہوتی اگر آپؑ کے دل میں بنی اُمیہ کے ہر فرد اور ان کے ہر عمل سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی اور ہر وہ کام جس میں وہ حصہ لیتے، یا جنگ و صلح میں جہاں وہ آگے بڑھتے ان کی ہر رفتار و گفتار سے امامؑ کو شدید نفرت ہوتی۔ اور یہ بالکل ظاہری بات ہے کہ انسان کو جس سے اذیتیں پہنچی ہوں اس کے ہر عمل سے نفرت محسوس ہوتی ہے اور بکثرت انسانوں کی زندگی میں یہی صورت حال نظر آتی ہے کہ وہ اپنے دشمن کے ہر عمل کو منفی پہلو سے دیکھتے ہیں۔

اسی طرح اگر امامؑ بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے تو بنی امیہ کا فروں کے مقابلے پر کسی معرکہ کارزار میں اترتے یا مشرکوں سے جنگ میں ان کو کامیابی ہوتی تو امامؑ کے دل میں نفرت کے احساسات پیدا ہوتے منفی ردعمل ظاہر ہوتا کیونکہ ان کا آگے بڑھنا بھی اسلام کی پیش رفت نہیں تھی۔ بلکہ منحرف گروہ کی کامیابی تھی اور بنی امیہ کی پیش قدمی تھی ایسے موقع پر تو اہلبیتؑ کے چاہنے والوں کی یہ تمنا ہو سکتی تھی کہ بنی امیہ کے پرچم تلے جو مسلمان جنگ کرنے جا رہے ہیں انھیں ہزیمت اٹھانی پڑے تاکہ بنی امیہ کی رسوائی ہو کیونکہ ان کی ذلت سے ان اہل ایمان کو سربلندی حاصل ہو گی جو ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں بلکہ حق کے راستے پر گامزن اور صراط مستقیم پر ثابت قدم ہیں۔

لیکن حضرت امام زین العابدینؑ نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا۔ بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھا کہ اگرچہ بنی امیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا کوئی شرعی اور اخلاقی جواز حاصل نہیں ہے لیکن اس وقت اسلامی کشتی کی پتوار بہرحال ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور

یہ لوگ جو کفار و مشرکین سے جنگ کرنے جا رہے ہیں ان کے حاکم بنی امیہ جیسے ظالم و جابر ضرور ہیں لیکن مد مقابل کفار و مشرکین ہیں جن کے پیش نظر تمام مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ چاہے ان کی حکومت قانونی ہو یا غیر قانونی۔ اگر اس غیر قانونی حکومت کی بجائے اسلام کی شرعی طور قانونی حکومت قائم ہوتی تب بھی ان کفار و مشرکین کا اصل ہدف مسلمانوں کی تباہی ہی ہوتا۔ چنانچہ امام عالی مقام کفار و مسلمین کی اس جنگ کے بارے میں یہی نقطہ نظر رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو فتح ہو تو پورے عالم اسلام کی بہتری ہے اور اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو پورے عالم اسلام کا نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام عالی مقام اس جنگ اور اس کے نتائج کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند رہا کرتے تھے۔ اور آپ کی توجہ اس بات پر مرکوز رہتی کہ سرحدی علاقوں کے پاسدار آگے بڑھ رہے ہوں، اسلامی مملکت کی حدود کو کفار و مشرکین سے بچا رہے ہوں جس کے نتیجہ میں مسلمان اپنے شہروں میں محفوظ رہیں۔ اور اگر کبھی دشمن کی جارحیت کی صورت ہو تو وہ بھی سخت اور جانگسل فوجی ذمہ داریوں کو انجام دے سکیں۔ یا اگر کبھی حفاظتی نقطہ نظر سے عسکری خدمات کی انجام دہی ضروری ہو یا بعض دشوار گزار علاقوں میں پیش قدمی کی ضرورت ہو، یا اسلامی تحریک یا اسلامی شوکت کے نئے مراحل کے لیے نئے مواقع پیدا کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اسے احسن طریقے سے انجام دے سکیں ۲۰

امام علیہ السلام چاہتے تھے کہ تمام مسلمان اس طرح زندگی گزاریں کہ انھیں ایک دوسرے کی فکر ہو اور احساس و شعور کی ایک ایسی لہر تمام مسلمانوں میں پیدا ہو کہ اشتراک عمل سے کسی قدر اتحاد اسلامی کی فضا پیدا ہو اور کفار و مشرکین جو طاقت کے نشے میں جنگ پر تلے رہتے ہیں یا ان کی للکار کے رد عمل کے طور پر اگر مسلمانوں کی طرف سے کفار کو چیلنج کیا جائے یا امن و امان اور سیاسی ضروریات کے تحت مسلمانوں کی جنبش ضروری ہو تو اس کے لیے اشتراک عمل نظر آئے۔

دعا بھی مسلمانوں کے لیے روحانی وجدان کو لبریز کرنے کا ایک عظیم وسیلہ ہے۔

Presented by www.ziaraat.com

جو اُن تمام معاملات میں بھی نہایت مفید ثابت ہوتا ہے جو جنگ کے تمام مراحل میں الگ الگ پیش آتے ہیں اس دعا کے اندر انسان تمام چھوٹی بڑی تفصیلات کو شامل کر کے بارگاہِ معبود میں پیش کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ پوری فضا جو اس کا احاطہ کیئے ہوئے ہے اور وہ پوری اندرونی کیفیت جو اضطراب کی حالت میں ہے اسے سکون مل جائے۔ اور تمام معاملات اور پوری فضا کے اندر گویا وہ خود بھی شامل ہو جائے۔

جیسے ایک انسان جو رزم آرائی کے موقع پر خود میدان جنگ میں موجود ہو جس میں تمام ذاتی تحفظات مٹ جائیں اور انفرادی احساسات ختم ہو جائیں اور حالت جنگ کی عمومی اسلامی فضا کے اندر ہر قسم کے خیالات ایک مرکز پر جمع ہو جانے کی وجہ سے موقف کی یکسانیت پیدا ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں سب کے احساسات ایک جیسے ہو جائیں۔ ایسی صورت میں اسلامی وحدت کی ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جو تمام مسلمانوں پر سایہ فگن ہو گی وہ حالات کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے ان تمام اساسی اور غیر اساسی اختلافات کو بھلا دیں گے جو گوناگوں طریقے سے ان کے افکار پر مسلط رہے ہوں۔

نتیجہ امام عالی مقامؑ کے اس اسلوب سے ہم یہ درس بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ:
حقائق کا سامنا کرنے کے لیئے ایک ہو کر جدوجہد کرنے میں شعوری پہلو کو تقویت پہنچانے سے "وحدت" کا مسئلہ زیادہ سہل ہو جاتا ہے اور اس فکری پہلو کی بہ نسبت اس میں بہت کم پیچیدگی ہے جس میں لوگ زیادہ الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے نزدیک بکثرت تحفظات اور متعدد اعتراضات ہوتے ہیں۔ جبکہ وہ مشترکہ روش جو تمام بنی نوع انسان کی زندگی سے وابستہ ہے، ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہے، اور ان تمام مواقع کے لحاظ سے جن کے درمیان ان کا وجود ابھر پاتا رہتا ہے اور جس سے ان کی عزت و کرامت وابستہ ہوتی ہے، ایک ایسی ہمہ گیر کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو تمام پیچیدگیوں کو شکست دے کر تمام متضاد حالات کو ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں

یہ کیفیت اس اختلافی مسئلہ کو بھی سیاسی اور امن و امان کے ہمہ گیر دائرے میں شامل کر دیتی ہے جسے سب محسوس کرتے ہیں۔ تاکہ سب مل کر یہ سوچ سکیں کہ دشمن کا حملہ سب کے وجود کو ختم کر دے گا۔ اور اگر دشمن ان پر مسلط ہو گیا تو نہ وہ خود باقی رہیں گے نہ ان کے اختلافی مسائل کی گنجائش رہے گی۔

✱

۲۔ اسلامی وحدت کے علمبرداروں کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی اس دعا کا جو آپ نے اہل سرحد کے لیے فرمائی اور اس کے اندر چھپے ہوئے سیاسی مضمون کا بہت باریک بینی سے ہمہ گیر مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ جنگ کے موقع پر جب بھی پوری قوم کے عسکری، سیاسی، روحانی، فکری اور اقتصادی معاملات کی منصوبہ بندی کی جائے تو امام عالی مقامؑ کی اس دعا سے صحیح معنوں میں اسلامی اور فکری رہنمائی حاصل کی جا سکے اور خطرناک حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلامی وحدت وجود میں آسکے۔ اور کفار و مشرکین کو مختلف اسباب و وسائل استعمال کر کے کمزور کیا جا سکے تاکہ وہ اپنی توانائیاں مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔

✱

اور اس دعا سے ہم نفسیاتی تربیت کا طریقہ بھی سیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دعاؤں میں شعوری پیغام رسانی کی نمود ہے جو ایک مرد مسلمان کے ضمیر میں مسلسل جنبش پیدا کرتی ہے۔ یہ پیغام رسانی فکر و احساس کی تنابوں کو چھیڑتی ہے۔ نفس کی انتہائی گہرائی تک اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے روحانی مضامین کے ذریعہ انسان ایک مقدس اور پاک و پاکیزہ وادی میں قدم رکھتے ہوئے خدا سے مناجات کرتا ہے۔ کیونکہ یہ دعا ایسے بلند افکار پر مشتمل ہے جس کی فطری پاکیزگی سے متاثر ہو کر انسان اپنی انسانی ذمہ داریوں کا احساس کرنے لگتا ہے۔ پھر یہ اندرونی تاثیر عملی اقدام کی طرف منتقل ہو جاتی ہے تاکہ انسان دوسروں کے مسائل سے تعلق پیدا کرے۔ کیونکہ اس دعا کی تاثیر کے نتیجہ میں انسان ان اہداف و مقاصد میں منہمک ہو جاتا ہے جو اس کے اور دوسروں کے درمیان مشترک ہیں۔ اور

ان بنیادی امتیازات سے دور ہو جاتا ہے جو فکری، موقع و محل یا موقف کے لحاظ سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنے والے ہیں۔

زہری نامی مشہور راوی نے "عصبیت" کے بارے میں حضرت امام زین العابدینؑ کا جو قول نقل کیا ہے وہ بھی وحدت مسلمین کے بارے میں سوچنے والوں کے لیے ایک سرمایۂ فکر ہے جس میں فرماتے ہیں کہ:

"وہ عصبیت جو انسان کو گناہگار بناتی ہے یہ ہے کہ انسان اپنی قوم و ملت کے برے لوگوں کو دوسری قوم و ملت کے اچھے لوگوں سے بھی بہتر سمجھنے لگے۔ لیکن صرف اپنی قوم سے محبت کرنا گناہ نہیں ہے اور نہ یہ عصبیت ہے۔ البتہ ظلم کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے۔"

اس فرمان سے اسلام کی اخلاقی روش کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے تعلقات ان دوسرے لوگوں سے جو حسب نسب، ملک و وطن، قومیت، دین اور مذہب کے لحاظ سے آپس میں تعلق رکھتے ہیں کیسے ہونے چاہئیں۔ تاکہ جو شخص مذکورہ بالا دائروں میں سے کسی دائرے کے اندر آتا ہو وہ ایک بھرپور انسان کی حیثیت سے ان تمام مسائل میں غور کر سکے جو میدان عمل میں پیش آتے ہیں اور اس کی فکر ایسی متوازن ہو کہ ذاتیات کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ بلکہ وہ پیش آنے والے معاملہ کو اس کی فطری پوزیشن میں رکھ کر اس کے اپنے دائرے میں سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کرے۔ جس کا ایک واضح نتیجہ یہ ہوگا کہ مثلاً اگر مسلمانوں کے مسائل کو اسلامی دائرہ میں رکھ کر سوچا جائے تو سنیوں کو شیعوں کی ضد میں تعصب سے کام لے کر ان پر ظلم و ستم کرنا چاہیئے اور نہ شیعوں کو سنیوں کی ضد میں تنگ نظری سے کام لے کر ان کے ساتھ ناانصافی کرنی چاہیئے۔ بلکہ پیش آنے والے مسئلے کو اس کی اپنی خصوصیات اور اپنے دائرے میں رکھ کر سلجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ قطع نظر اس بات کے کہ جس کو یہ مسئلہ پیش آیا ہے وہ ذاتی طور سے کس مذہب سے منسوب ہے مثلاً

کیونکہ یہی عدل کا تقاضہ ہے تصوراتی اور عملی اعتبار سے بھی اور فیصلہ کے موقع پر بھی۔
اور یہ بات عقل و شعور رکھنے والی ذہنیت کو تاکید کرتی ہے اور اس وحدت کی روح کا پیغام
سناتی ہے جو چیزوں میں غور و فکر کرتے وقت اس کی ذاتی بنیادوں پر مرکز ہو۔ تاکہ انسان حق کے
راستہ پر عقل کے ساتھ چلے نہ یہ کہ تعصب کے راستے پر جذبات کے دباؤ کے تحت چل پڑے۔

23 حضرت امام زین العابدینؑ کے ایک مشہور جملے جو ان کے بعض اصحاب نے نقل کیا ہے کہ:
"اسلام کی محبت میں ہم سے محبت کرو" (لوگو ہماری محبت میں اسلام
سے محبت کرو)۔

ہم یہ استفادہ بھی کر سکتے ہیں کہ اہلبیت طاہرینؑ کا اسلوب حیات یہ ہے کہ ہر وہ شخص
جو اہلبیت طاہرینؑ سے روحانی محبت رکھتا ہے وہ ان کی محبت میں اس طرح ڈوب جائے کہ
اسلامی صفات کا مظہر بن جائے نہ یہ کہ اپنی انفرادی صفات کو ابھار کر تا رہے۔
امامؑ کا یہ فرمان ہمارے باہمی تعلقات و طریق حیات کی بنیاد اسلام کو قرار
دیتا ہے کہ انسان اسلام کی حقیقی اقدار کے آگے سرنگوں رہے۔ بحث و مباحثہ اور جذباتی
مراحل میں بھی اسی کشادگی کو برقرار رکھے 23

✿ ✿

24 حضرت امام جعفر صادقؑ کا طریقہ کار یہ تھا کہ اپنے شیعوں کو دعوت دیتے تھے
کہ وہ دوسرے مسلمانوں، اہل سنت حضرات سے میل جول رکھیں۔ اسلامی اجتماعات میں شرکت
بنیادوں پر دل کھول کر حصہ لیں۔ چنانچہ عبداللہ بن سنان کی روایت ہے کہ آپؑ نے
ارشاد فرمایا ہے:
"میں تم لوگوں کو خداوند عالم سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں،
لوگوں کو اپنی گردنوں پر مسلط نہ کرو ورنہ رسوا ہو جاؤ گے۔
خداوند عالم نے قرآن مجید میں حکم دیا ہے کہ: لوگوں سے اچھی بات کہو"

پھر فرمایا:

"ان کے بیماروں کی مزاج پرسی کرو۔ انتقال کر جائیں تو ان کے جنازہ میں شرکت کرو، ان کے معاملات میں گواہی دو، ان کے ساتھ ان کی مساجد میں نماز پڑھا کرو۔"

اور اسحاق بن عمار کا بیان ہے کہ مجھ سے امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا:

"اے اسحاق! کیا تم ان لوگوں (اہلسنت) کے ساتھ ان کی مسجدوں میں نماز پڑھتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: "جی ہاں۔"

تو فرمایا کہ:

"پڑھتے رہنا، ان کے ساتھ صف اوّل میں نماز پڑھنا خدا کی راہ میں تلوار کھینچنے جیسا ہے۔"

اسی طرح اور بھی متعدد حدیثیں ان سے اور ان کے پدر بزرگوار سے منقول ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محض تقیہ کا مسئلہ نہیں تھا جس میں جان کے خوف سے ان لوگوں کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہو۔ بلکہ امام ؑ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کے باہمی تعلقات میں ایک اسلامی کشادہ دلی پیدا ہو۔ وہ گروہی تعلقات سے بلند ہو کر سوچیں، وہ اسلام کی ہمہ گیر اخلاقی روش میں ڈھل جائیں جو ایک مرد مسلمان کو خوش اخلاقی کا نمونہ بناتی ہے اور یہی اس حدیث کا بھی مضمون ہے جس کو ابو علی نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"میں نے امام جعفر صادق ؑ سے عرض کیا کہ ہمارے یہاں مخالفین کا ایک امام ہے جو تمام شیعوں سے عداوت رکھتا ہے۔ کیا میں اس کی مسجد میں بھی جا سکتا ہوں؟"

فرمایا کہ:

"بے شک، اگر تمھاری یہ بات سچی ہے تب بھی تم ہی کو اس بات کا زیادہ حق ہے کہ مسجد میں سب سے پہلے جاؤ اور سب کے آخر میں نکلو، تمام لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور اچھی بات کہو۔"[۱۷]

حاشیے: حضرت امام جعفر صادقؑ شیعوں کی ایسی تحریک کا قصد و ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ ان کی مخصوص مسجدیں اور سنیوں کی مخصوص مسجدیں اس طرح الگ الگ ہوں کہ دونوں فرقے کے لوگ کسی ایک مسجد میں مشترکہ طور سے نماز پڑھ ہی نہ سکیں۔ کیونکہ اس سے اسلام کو ظاہری طور سے بھی نقصان پہنچے گا اور عالم اسلام کے وجدان میں جو اس کی پسندیدہ روش ہے وہ بھی متاثر ہوگی۔ خاص طور سے جمعہ اور جماعت کی نماز؛ جو ایک عمومی مظہر ہے جس سے خدا کی بارگاہ میں یکرنگی کا بہت مضبوط تاثر نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے شیعوں کے لیے یہ بات پسند کی کہ جب امت اسلامیہ کے بلند ترین مقاصد کی خاطر وقتی مصلحت کا تقاضہ ہو تو امام جماعت کی شرائط میں جو خصوصی تحفظات ہیں ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ حاشیے

❋

البتہ کچھ ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو اس نقطۂ نظر کے خلاف ہیں، جن میں شاید مخصوص حالات کے اندر شیعوں کی کچھ منفرد مذہبی خصوصیات کی حفاظت اور فکر و نظر میں توازن پیدا کرنے کے لیے تاکید کی گئی ہے کہ ولایت مطلقہ کے سلسلہ میں اپنے مقررہ راستہ پر پوری سختی سے جمے رہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ دونوں قسم کی احادیث کو سامنے رکھ کر موقع و محل کی مناسبت سے اپنے دینی فریضہ کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔

❋

اوپر بیان کی جانے والی حدیث میں کہا گیا ہے کہ: "لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور اچھی بات کہو۔" اسی کے ساتھ امامؑ نے قرآن مجید کی آیت: "لوگوں سے شائستہ بات کرو" سے استدلال فرمایا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ اپنے شیعوں

کو تاکید کرنا چاہتے ہیں کہ وہ گفتگو میں ایسی روش نہ اختیار کریں جس سے دوسرے مسلمانوں کے احساسات ان لوگوں کے بارے میں مجروح ہوں جن کے بارے میں لوگ مختلف نظریات رکھتے ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہے کہ وہ لعن طعن اور سب و دشنام کے ایسے طریقے اختیار کرنے لگتے ہیں جن سے دوسروں کے جذبات بھڑک اٹھیں اور وہ بھی ردعمل کے طور پر ضد اور ہٹ دھرمی پر اُتر آئیں۔ یہ بات قرآن کی ان ہدایات کے بالکل خلاف ہے جن میں اچھی بات کہنے اور شائستہ طریقے سے مخالف کی بات رد کرنے اور خوش اسلوبی کے ساتھ بحث و مباحثہ کی تاکید کی گئی ہے۔ اور قرآن کی یہ ہدایت ان تمام باتوں کے بارے میں ہے جن میں بنی نوع انسان کے درمیان اختلاف ہو، چاہے وہ کسی چیز پر ایمان رکھتے ہوں یا اس کا احترام کرتے ہوں یا اس کی عظمت کے قائل ہوں اور دوسرے لوگ اس سے مختلف نظریہ رکھتے ہوں۔

کیونکہ شائستہ طریق کار ہی وہ روش ہے جو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو استوار رکھ سکتی ہے۔ حق بات سننے اور قبول کرنے کے لیے ان کے دل میں گنجائش پیدا کر سکتی ہے، اور انھیں اتحاد و اتفاق کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔

روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا کہ:

"لوگوں کو راضی رکھنے کا کتنا آسان طریقہ ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔"

امام یہ حکم نہیں دے رہے ہیں کہ: "افکار و نظریات میں لوگوں سے ہم آہنگ ہو جاؤ" کہ آپ کہنے لگیں کہ:

"ہم اپنے نظریات سے دستبردار نہیں ہو سکتے"

بلکہ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ فریق مخالف کے روبرو، دوران گفتگو ایسے سخت الفاظ استعمال نہ کریں جس سے اس کے جذبات مجروح ہوں۔ جیسے لعن اور دشنام

وغیرہ کے الفاظ ۔

بالفاظ دیگر آپ کے لیے پسندیدہ روش یہ ہے کہ :

دوسرے لوگ جن چیزوں کا احترام کرتے ہوں اور جن شخصیتوں کی عظمت کے قائل ہوں ان کے بارے میں آپ نامناسب کلمات نہ کہیں ۔ اور جہاں تک فکری مباحث یا فقہی اختلافات کا تعلق ہے قرآن میں حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بحث و مباحثہ اور تنقید و مناظرہ کی بھی گنجائش موجود ہے اور عمدہ طریقے سے مکالمے کی بھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ نظریات کے بارے میں مناظرہ و مکالمہ اور چیز ہے اور الفاظ کے ذریعے دوسروں کا دل زخمی کرنا اور بات ہے ۔ بعض لوگ ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر کے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اپنے عقائد و نظریات کے ساتھ اخلاص یہ ہے کہ دوسروں کے عقائد پر جارحانہ انداز سے حملہ آور ہو کر ان کی دھجیاں بکھیری جائیں ۔ کیونکہ ان کی رائے میں اس سے یہ احساس ہوگا کہ ہم ان کے موقف کا بھرپور انکار کرتے ہیں اور اپنے اس موقف پر سختی سے قائم ہیں کہ ہم مخالفین کے طرز فکر کے ماضی میں بھی منکر تھے اور اب بھی شدت سے انکار کرتے ہیں اور اپنے قائم کردہ نظریات کی قربانی دینے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہیں ۔ اس طرح دوسرے اسلوب اور دوسرے نظریہ کی مخالفت میں شور و غوغا کے لیے ایک نفسانی فضا پیدا ہونے لگتی ہے ۔ جس میں فریق مخالف کے لیے برداشت کا عنصر ختم ہو جاتا ہے ۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے ۔ کیونکہ مقصد یہ نہیں ہے کہ کس طرح احساسات کو ابھارا جائے یا غیظ و غضب کے چشمے پھوٹ پڑیں ۔ بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ فکر میں گہرائی ہو دلیل میں قوت ہو ، موقف میں استحکام ہو اور راہ حق میں کوشش ہو ۔ اور جو راہیں اس خوش آئند منزل تک پہنچاتی ہیں ، وہ عقل کی رسائی ، قلب کی کشادگی اور کلام کی پاکیزگی ہے ۔ تاکہ انسان مشترکہ باتوں میں تحقیق کر کے خیر و فلاح ، فکر و نظر ، لطف و محبت اور بیدار مغزی کے آسان راستوں سے دوسروں کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ سکے ۔ کیونکہ ہر انسان اس صورت

میں اپنی انسانیت سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب اسے ایسی روحانی فضا نصیب ہو کہ اس کے عقل و خرد کا احترام کیا جائے، اس کے شعور و احساس کا لحاظ رکھا جائے اور اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے بہت نرم روش کے ساتھ اس کے قلب کے تاروں کو چھیڑا جائے جس میں سختی و سنگدلی کے بجائے لطف و مدارات کی ترجمانی ہو رہی ہو۔

✹

29 ہم جب ائمہ طاہرین علیہم السلام کی عملی روش کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ حضرات تمام مسلمانوں کے ساتھ ان کے جملہ ثقافتی و اجتماعی معاملات میں نہایت کشادہ دلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں دوسرے فرقوں کے لوگ بھی اتنے زیادہ تھے کہ عقائد و فقہ کے لحاظ سے مختلف مذاہب کی نمائندگی نظر آتی ہے اور آپ حضرات کی بزم میں مختلف افکار و خیالات کے اشخاص یکجا نظر آتے تھے، نہ کوئی پیچیدگی نظر آتی تھی نہ کسی کو امام کی گفتگو سنتے وقت یا اپنا موقف پیش کرتے وقت، یا فضا کے متاثر ہونے یا نظریاتی اسلوب کے مختلف ہونے سے کوئی دشواری محسوس ہوتی تھی ۔ جس کی وجہ سے ہمارے ائمہ علیہم السلام پورے اسلامی سوسائٹی میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو علم کلام کی اصطلاح میں ان کو امام نہیں مانتے تھے بلکہ مخالف عقیدہ رکھتے تھے، وہ بھی ان کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے۔

ہمارے ائمہ کو یقین تھا کہ گھٹی ہوئی روح، تنگ سینہ، ناشائستہ جملہ بازی کا طریقہ، تند نگاہ، اور مخالفانہ فضا پیدا کرنے سے کوئی ایسا مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا جو اس نظریہ سے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں یا اس عقیدہ سے جسے ہم اپنائے ہوئے ہیں ہم آہنگ ہو۔ اور وہ حضرات اپنے اصحاب کو تاکید کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو بھی اس نگاہ سے دیکھیں جس طرح دوسروں سے پیش آنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اخلاقیات کے اس مشہور و معروف قانون پر عمل پیرا ہو سکیں کہ :

"عاملِ الناس کما تحب ان یعاملوک بہ"
"دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا سلوک تم اپنے لیے
پسند کرتے ہو"

کیونکہ فکری بحث و مباحثہ کا مسئلہ تحقیق ہونے کے ساتھ اخلاقی بھی ہے اور
جس طرح جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے فکر و خرد ضروری ہے اسی طرح فکری مسائل
میں بھی احساسات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ توازن برقرار رہے۔ اور آخری بات یہ کہ
ہمیں یقین ہے کہ اسلامی وحدت کا مسئلہ درحقیقت اسلام کی طاقت و توانائی
استحکام و پائیداری، فعال حیثیت، جنبش عمل اور زندگی کے مسائل پر اس کے محیط ہونے کا
مسئلہ ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اسے ہم اپنی زندگی میں جاری و ساری رکھیں، اور اپنی
اسلامی روش کے درمیان، موقف کے استحکام اور طریق کار کی سنگینی کے مابین جو واضح فرق
ہے اسے ملحوظ رکھیں اور وہ نفسانی کیفیت جس میں تصادم تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور وہ
ذہنی حالت جو مفاہمت و ہم آہنگی تک لے جاتی ہے، ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم رکھیں۔
اور ہمارے اندر یہ احساس بیدار رہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
اور ان کے اہلبیت طاہرین کے ساتھ خلوص کا لازمی نتیجہ اور بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں دین اسلام
کے ساتھ پورا خلوص ہو۔ اور ہم یہ بات پوری شدت سے محسوس کریں کہ دوسرے ہر موقف
کے مقابلے میں اسلام کا موقف ہی سلامتی کا موقف ہے اور دوسرے تمام نظریات کے مقابلہ
میں اسلامی نظریہ حیات میں ہی سب سے زیادہ طاقت و شوکت ہے۔ اگر ہم نے اسلامی تعلیمات
کے سلسلہ میں کامیابی حاصل کر لی، اسے معاشرے پر جلوہ فگن کر دیا تو اس کے اسرار و رموز،
اصول و قواعد، روش و اسلوب اور جنبش و حرکت، غرض تمام امور میں کامیابی حاصل
ہو جائے گی۔

30 لیکن اگر خدانخواستہ کفر سے رزم آرائی و معرکہ آرائی میں اسلامی قوتوں کو شکست

ہوگئی تو ہم ہر قسم کی بازی ہار جائیں گے۔ کیونکہ وہ تمام اقدار جن کا ہم احترام کرتے ہیں، وہ نظریات جن کے ہم پابند ہیں اور وہ موقف جس کے بارے میں ہم نہایت حساس ہیں ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا اور وہ میدان جس میں مسلمانوں پر کفار مسلط ہوں اس میں ان باتوں کے باقی رہنے کے امکانات ہی معدوم ہوجائیں گے۔

کسی کافر یا منافق کی زبان سے اگر ہم اہلبیت طاہرین علیہم السلام کی سیرت و کردار کے کسی پہلو کی تعریف سنیں لیکن اس کافر یا منافق کا مقصد یہ ہو کہ ان کی شخصیت کی عظمت کا تو اعلان کرے لیکن ان کے پیغام سے ہمیں دور کرے۔ تو اس مدح و ثنا کی کیا قیمت ہے۔ جبکہ ہمیں یہ بھی احساس ہو کہ کفر کی یہ طاقتیں مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو ابھار کر کے دین اسلام ہی کو کمزور کرنا چاہتی ہیں ہے

❋

اس لیے ہم اس بات کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کے تمام مکاتب فکر کے درمیان "وحدت اسلامی" قائم کرنے کے لیے عمل اور فکری منصوبہ بندی کی جائے تاکہ اسلام کی ہمہ گیری کے ساتھ جو اخلاص ہونا چاہیے اس پر کسی خاص مکتب فکر کے ساتھ اخلاص کا جذبہ غالب نہ آنے پائے۔

اور اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ہم عقیدہ اشخاص کے ساتھ وابستگی اور اسلامی پیغام حیات کے اسرار و رموز کے ساتھ وابستگی میں فرق ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ اس لحاظ سے اخلاص برتنا چاہیے کہ وہ اس پیغام حیات میں ہمارے ہم سفر ہیں تاکہ ہم جو موقف اختیار کریں وہ اسلامی دائرہ میں ہو۔ تاکہ زندگی کے معاملات اور احساسات و عقل و فکر سب ہم آہنگ ہو کر انسان کا خدا سے، ایک انسان کا دوسرے انسان سے اور ایک انسان کا الٰہی طریقۂ زندگی سے رابطہ قائم ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

والسلام خیر ختام (محمد حسین فضل اللہ)